© rasailojaraid.com

کا رنگ مختلف تھا۔ کسی سیمینار، کسی کانفرنس میں ان کی تقریر اپنے ''مواد'' کے علاوہ ''انداز'' میں بھی ایک پروفیسر اور اسکالر کا رنگ لیے ہوتی۔ وہ روسٹرم پر مُکّے برسانے اور گلے کے پورے زور سے حاضری کے لیے سمع خراشی کا باعث بننے کی بجائے دھیمے لہجے میں الفاظ کے مناسب زیروبم کے ساتھ سامعین کو مسحور کردیتے۔ زورِ خطابت اور شورِ خطابت کے بجائے استدلال کے ساتھ اپنی بات کو آگے بڑھاتے اور سامعین کو مٹھی میں کرلیتے۔ وہ انگریزی کے استاد تھے، لیکن اردو میں تقریر کرتے ہوئے انگریزی سے مکمل پرہیز کرتے۔

وہ دوستوں کے دوست تو تھے ہی، دشمنوں کے بھی دوست تھے کہ ان کے لیے بھی اس کے ہاں خیر خواہی کے سوا کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ انسانی تعلقات کے حوالے سے وسیع المشرب تھے۔ زاہدوں کے علاوہ رِند بھی ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے کہ وہ انسانوں سے مایوس نہیں ہوتے تھے۔ کیا خبر کب انسانی فطرت کا خیر، شر کے جذبے پر غالب آجائے۔ جنگ/ نیوز والے رؤف کلاسرا، فکر ونظر میں بُعد المشرقین کے باوجود ان کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ وہ اپنے مسائل کے حوالے سے دوستوں کو آزمائش میں ڈالنے سے حتی الامکان گریز کرتے، لیکن ان کے مسائل میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لیتے۔ ان کے مسئلے کو اپنا مسئلہ بنالیتے اور جب تک اسے حل نہ کرلیتے، چین سے نہ بیٹھتے۔ صاحب تدبر ایسے کہ پیچیدہ مسائل کا حل چٹکیوں میں ڈھونڈ نکالتے۔ انگریزی کے علاوہ اردو ادب پر بھی گہری نگاہ تھی۔ اقبالیات سے خصوصی شغف تھا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے مکہ مکرمہ والی نشست میں اور گزشتہ ماہ ڈاکٹر خورشید رضوی کے ساتھ جدہ کی نشستوں میں بھی بیشتر گفتگو اقبالیات ہی کے حوالے سے ہوئی۔

وہ غزل بھی کہہ لیتے تھے، لیکن زیادہ تر آزاد نظم ہی کہی اور اس پر اصحاب نقد ونظر سے داد وتحسین بھی پائی۔ اُم القریٰ یونیورسٹی میں تدریسی سرگرمیوں کے علاوہ مختلف تصنیفی، تالیفی اور تحقیقی منصوبوں پر بھی کام کررہے تھے۔ اس میں سعودی عرب کے قدیم ادب وثقافت پر کام بھی تھا، جس میں انھیں ملتان کے پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری اور پاکستان انٹرنیشنل سکول جدہ کے ڈاکٹر امتیاز بلوچ کا تعاون بھی حاصل تھا۔ سعودی عرب میں اردو ادب پر کام کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔ گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان کے پروفیسر محمود الحسن ''اردو ادب وخطابت کی روایت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمات'' پر پی ایچ ڈی کررہے تھے کہ اسی دوران آسمانوں سے بلاوا آگیا۔ اس ادھورے کام کی تکمیل بھی ذوالکفل کے پیش نظر تھی، لیکن اُدھر مہلت عمل ختم ہوگئی تھی۔ 15/ نومبر کو نمازِ ظہر پڑھ کر یونیورسٹی سے گھر کے لیے روانہ ہوئے، ابھی راستے ہی میں تھے کہ دوسری سمت سے آنے والی ایک تیز رفتار گاڑی ان کی کار سے آٹکرائی اور بندہ اپنے رب کے حضور حاضر ہوگیا۔ وصیت تھی کہ اگر سرزمین حرم میں موت آئے تو یہیں دفن کردیا جائے۔ نمازِ فجر کے بعد حرم میں نمازِ جنازہ ہوئی اور جنت المعلیٰ میں آسودۂ خاک ہوگئے:

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

(روزنامہ ''اردو نیوز'' جدہ، 19/ نومبر 2009ء/ روزنامہ ''پاکستان'' 20/ نومبر 2009ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انا للہ وانا الیہ راجعون

سجاد جہانیہ

چہار جانب عمارت کے بیچوں بیچ ایک وسیع صحن ہے اور ایک کشادہ پھیلاؤ والے درخت تلے کتنی ہی چار پائیاں بچھی ہیں۔ جن پر یہاں وہاں افسردہ لوگ بیٹھے ہیں۔ شمالی سمت لائبریری ہے۔ اس کی دیوار کے ساتھ چار پائیوں کے بیچ ایک کرسی دھری ہے۔ کرسی پر دودھ ایسی اجلی دراز ریش اور ویسی ہی اجلی رنگت والے ایک بزرگ بیٹھے ہیں۔ انھوں نے ٹیک چھوڑ رکھی ہے۔ دو کہنیاں کرسی کے بازوؤں پر ہیں اور بائیں ہاتھ کی پشت کو داہنے ہاتھ کی ہتھیلی سے سہلایا کرتے ہیں۔ لوگ آتے ہیں۔ ان سے مصافحہ کرتے ہیں۔ پرسا دیتے ہیں۔ یہ کمال ضبط سے پرسا لیتے ہیں اور آنے والے کو بیٹھنے کا کہتے ہیں۔ میں اور جمشید رضوانی ان بزرگ سے مل کر بیٹھ چکے ہیں۔ اتنے میں ایک سرو قامت نیم سپید، نیم سیاہ داڑھی والے نوجوان مردفون سنتے ہوئے آتے ہیں۔ سب کے ساتھ ساتھ ہم سے بھی گلے ملتے ہیں۔ جب بھی کوئی تعزیت کے کلمات بولتا ہے تو ان کے چہرے کے خطوط متغیر ہونے لگتے ہیں، آنکھیں گویا چھلک پڑنے کو ہوتی ہیں لیکن فوراً ہی وہ با آواز بلند انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے لگتے ہیں۔ ''بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں'' یہ کلمات ان کے ضبط کی گرتی ہوئی دیوار کو پھر سے استوار کر دیتے ہیں۔

یہ منظر شہر ملتان کے چوک پل مردہ خانہ کے پہلو میں واقع دار بنی ہاشم کا ہے۔ کرسی پر بیٹھے بزرگ وکیل شاہ صاحب ہیں اور جو فون سنتے ہیں، ان کا نام کفیل شاہ بخاری ہے۔ امیر شریعت کے گھر کا یہ آنگن ہے اور ان دونوں حضرات میں سے اول الذکر کا فرزندِ ثانی اور موٴخر الذکر کا برادر خورد اور ہمارا دوست ذوالکفل بخاری ایک ہی روز قبل مکہ مکرمہ میں اذنِ ایزدی کی بجا آوری میں پیام براجل کو لبیک کہہ گیا ہے۔ مرحوم کو ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی آخری آرام گاہ کے قریب ہی آسودہ خاک کیا جا چکا ہے۔ ایسی جگہ اور ایسی زمین میں روزِ محشر تک کے لیے جگہ مل جانا ہر مسلمان کی خواہش ہے اور آرزو۔ مگر کیا اب عینک کے شیشوں کے عقب سے مسکراتی ہوئی مگر شوخی سے بھرپور آواز اب یہ کان کبھی نہ سن پائیں گے۔ اب اس آنگن میں کوئی ہمیں گاڑی تک رخصت کرنے نہیں آئے گا اور بالکل آخری لمحے پر روک کر یہ نہ کہے گا ''اچھا اک لطیفہ سندے جاؤ'' موت تو ہر سانس لینے والے کا مقدر و منتہیٰ ٹھہری مگر ایسی جلدی اور ایسی اچانک۔ لیکن جب اس مٹی کے گھر میں بولنے والی روح کے لیے رجوع کرنا ہی انجام ہے تو کیسی جلدی اور کیا اچانک۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدت ہوئی کہیں پڑھا تھا کہ جب کشمیر میں کسی شادی شدہ کی وفات ہو جائے تو اس کی بیوہ میت پر ’’ہے تو بو‘‘ کہہ کر بین کرتی ہے۔ ان کشمیری الفاظ کو اگر اردو کا جامہ پہنایا جائے تو ’’ہائے میری روٹی‘‘ بنتا ہے۔ سچی بات ہے جب پندرہ نومبر کی شب جمشید نے فون پر شاہ جی (ذوالکفل بخاری) کی وفات بارے بتایا تو میرا جی چاہا کہ میں بھی بلند آہنگ سے ’’ہائے میرا ناشتہ، ہائے میرا ناشتہ‘‘ کے بین کروں۔ ناشتوں کا اہتمام کرنا اور دوستوں کو جمع کرنا شاہ جی کا پسندیدہ شغل تھا۔ پتا نہیں امیر شریعت کے اس گھر میں ناشتے کا دسترخوان دوستوں کے آگے دراز کرنے کی روایت کب سے ہے۔ تاہم پچھلے بارہ برسوں سے چنیدہ دوستوں کے اس ناشتے کا ایک شریک میں بھی رہا ہوں۔ اس ناشتے کے لیے یوں تو کوئی لگے بندھے ایام نہ تھے۔ تاہم عیدین پر، عید کے دوسرے تیسرے روز تو یہ اہتمام ضرور ہوتا۔ عیدین کے ناشتے کی حکمت یہ تھی کہ وہ دوست جو بسلسلہ روزگار شہر سے باہر قیام رکھتے تھے، وہ ان تہواروں پر دستیاب ہوتے۔ خالد مسعود، رؤف، جمشید اور میں تو عیدین کے ان ناشتوں کے یقینی مہمان ہوتے باقی بدلتے رہتے۔ ناشتہ ایسا بھرپور اور متنوع کہ آپ سارے لوازمات چکھ نہیں سکتے۔ پھر شاہ جی گھر کے اندر چکر پہ چکر لگاتے اور کسی کے لبالب جگ لاتے۔ بہ اصرار ایک ایک ڈش اٹھا کر سب کو پیش کرتے۔ ایسے میں کبھی ان کے والد وکیل شاہ صاحب بھی گھڑی کی گھڑی آن بیٹھتے تو منڈلی قدرے سنجیدہ ہو جاتی۔ کفیل شاہ تو خیر موجود ہی رہتے۔ امیر شریعت کو میں نے نہیں دیکھا تاہم مختار مسعود نے اور دیگر تذکرہ نگاروں نے اپنی تحریروں میں ان کا جو حلیہ باندھا ہے، میرا خیال ہے کہ وہ ہو بہو کفیل شاہ جیسے رہے ہوں گے۔ (1)

پچھلے چھے برسوں سے ناشتے کے ان جلسوں میں وقفے بڑھ گئے تھے اور یہ سلسلہ کسی قدر بے قاعدگی کا شکار تھا۔ اس کی وجہ شاہ جی کا سعودی عرب کے ایک کالج میں پروفیسر مقرر ہونا تھا مگر جو بھی عید وہ یہاں کرتے، اس کے دوسرے تیسرے روز ناشتے کی محفل ضرور جمتی۔ گزشتہ برس کے اواخر میں شاہ جی کا کنٹریکٹ ختم ہوا تو وہ کوئی چھے ماہ تک ملتان میں رہے۔

’’خبریں‘‘ کے قارئین کو یاد ہوگا کہ انھوں نے ادارتی صفحہ پر اس دوران کالم بھی لکھے۔ افسوس کہ ایسی خوبصورت اور پرشکوہ نثر لکھنے والا قلم خاموش ہو گیا۔ سالِ رواں کے ابتدائی ایام میں انھوں نے ایک ناشتے کا اہتمام کیا۔ ان کا فون موصول ہوا مگر میں شہر سے باہر تھا، جمشید بھی نہ جا سکا اور میرا خیال ہے شاید خالد مسعود بھی۔ اس خفت کو مٹانے کے لیے میں اور جمشید پروگرام بناتے رہے کہ اپنے ہاں ناشتے یا کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ شاہ جی کو اور دیگر دوستوں کو اکٹھا کریں گے۔ مگر ’’اے بسا آرزو کہ خاک شدہ‘‘۔ ہم دونوں وقت ہی طے نہ کر سکے اور شاہ جی ایک مرتبہ پھر عازمِ سعودی عرب

(1) صاحبِ مضمون حسن ظن ہے اور حقیقت یہ ہے کہ امیر شریعت کی شکل وشباہت، قامت وجسامت، علم وعمل، اخلاق وکردار اور جرأت وشجاعت کی جھلک ان کے چاروں فرزندوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے محاسن اُن کی ذریت میں بھی ودیعت فرما دیں۔ میں کیا اور میری مماثلت کیا؟ اک بس ذرۂ حقیر کو اُن سے نسبت حاصل ہو گئی۔ الحمدللہ (کفیل)

© rasailojaraid.com